رسائل و مسائل

کیا بالغ عورت خود اپنا نکاح کر لینے کی مجاز ہے؟

سوال "علماء احناف اور علماء اہل حدیث کے درمیان نکاح بالغہ بلا ولی کے مسئلہ میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ احناف اس کے قائل ہیں کہ بالغہ عورت اپنا نکاح اولیاء کے اذن کے بغیر یا اُن کی خواہش کے علی الرغم، جہاں چاہے کر سکتی ہے اور اس نکاح پر اولیاء کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اہل حدیث حضرات ایسے نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نکاح بلا ولی کی صورت میں بلا تامل دوسرا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ فریقین کے دلائل، جہاں تک میرے سامنے ہیں، مختصراً پیش کرتا ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ آپ اس بارے میں اپنی تحقیق واضح فرمائیں"

اس سوال کے ساتھ سائل نے پوری تفصیل کے ساتھ فریقین کے دلائل جمع کر دیئے ہیں جنہیں یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

حنفیہ کا استدلال حسب ذیل آیات اور احادیث سے ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ	تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں
اَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ	تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں
اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ج فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ	پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو جو کچھ وہ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ	اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے
بِالْمَعْرُوْفِ ط (البقرہ۔ ۲۳۰)	کریں، اس کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ	پھر اگر (تیسری بار شوہر نے بیوی کو) طلاق دے

حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ط . . . .

(البقرہ-۲۹)

دی، تو وہ عورت اُس کے لیے حلال نہ ہوگی اِلّا یہ کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

. . . . فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ -

(البقرہ-۳۰)

. . . . پھر تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کریں، جب کہ وہ بھلے طریقے سے باہم رضامند ہو جائیں۔

عَنْ نَافِعِ ابْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَّلِيِّهَا وَالْبِكْرُ تُسْتَاْمَرُ وَاِذْنُهَا سُكُوْتُهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ اَلثَّيِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَّلِيِّهَا -

(نصب الرایہ ج ۳ ص ۱۸۳)

نافع ابن جبیر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت اپنے ولی سے زیادہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی حقدار ہے اور کنواری کا مشورہ لیا جانا چاہیے اور اس کی اجازت اُس کی خاموشی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنے نکاح کے معاملے میں حقدار ہے۔

عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ جَاءَتْ اِمْرَاَةٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اِنَّ اَبِيْ اَنْكَحَنِيْ رَجُلًا وَّاَنَا كَارِهَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَبِيْهَا لَا نِكَاحَ لَكَ اِذْهَبِيْ فَانْكِحِيْ مَنْ شِئْتِ

(ایضاً)

ابی سلمہ ابن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا میرے باپ نے میرا نکاح ایک مرد سے کر دیا ہے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں آپ نے باپ سے فرمایا کہ نکاح کا اختیار تمہیں نہیں ہے اور لڑکی سے فرمایا جاؤ جس سے تمہارا جی چاہے نکاح کر لو۔

رُوِيَ مِنْ طَرِيْقِ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا

مالک نے عبدالرحمٰن سے، انہوں نے اپنے باپ سے، اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے

زَوَّجَتْ حَفْصَةَ بِنْتَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مِنَ الْمُنْذِرِ ابْنِ زُبَيْرٍ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ غَائِبٌ بِالشَّامِ ۔ فَلَمَّا قَدِمَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ قَالَ وَمِثْلِي يُفْتَاتُ عَلَيْهِ ؟ فَكَلَّمَتْ عَائِشَةُ الْمُنْذِرَ ابْنَ زُبَيْرٍ فَقَالَ إِنَّ ذٰلِكَ بِيَدِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ۔ فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ مَا كُنْتُ لِأَرُدَّ أَمْرًا قَضَيْتِهِ فَاسْتَقَرَّتْ حَفْصَةُ عِنْدَ الْمُنْذِرِ وَلَمْ يَكُنْ ذٰلِكَ طَلَاقٌ (ایضاً)

کہ انہوں نے حفصہ بنت عبدالرحمٰن کا منذر ابن زبیر سے نکاح کر دیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن شام میں تھے۔ جب وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ کیا میری رائے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ تب حضرت عائشہ نے منذر ابن زبیر سے بات کی، انہوں نے کہا کہ فیصلہ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ سے کہا کہ جس معاملے کو آپ نے طے کر دیا ہے میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ حفصہ منذر کے پاس ہی رہیں اور یہ طلاق نہ تھی۔

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ ۔

...عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الثَّيِّبِ أَمْرٌ (ایضاً)

ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شوہر دیدہ عورت پر ولی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔

أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَأَحْمَدُ ..

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ فَتَاةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ أَبِيْ زَوَّجَنِيْ ابْنَ أَخِيْهِ لِيَرْفَعَ بِيْ مِنْ خَسِيْسَتِهِ ۔ قَالَ فَجَعَلَ الْأَمْرَ إِلَيْهَا فَقَالَتْ إِنِّيْ قَدْ أَجَزْتُ مَا صَنَعَ أَبِيْ، وَلٰكِنْ أَرَدْتُ أَنْ تَعْلَمَ النِّسَاءُ أَنْ لَيْسَ

نسائی اور احمد نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ ایک لڑکی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! میرے باپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ میرا بیاہ صرف اس لیے کر دیا ہے کہ میرے ذریعے سے اُسے ذلت سے نکالے۔ آپ نے نکاح (کی تنسیخ و استقرار) کا حق لڑکی کو دے دیا۔ لڑکی نے کہا میرے والد نے جو کچھ کیا ہے میں اسے جائز قرار دیتی ہوں۔ میری خواہش صرف یہ تھی

إِلَى الْآبَاءِ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ

کہ عورتیں جان لیں کہ باپوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

اہل حدیث حضرات اپنی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث پیش کرتے ہیں:۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا اِمْرَاَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ ۔۔۔۔ فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهَا۔ (بلوغ المرام)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے، اُس کا نکاح باطل ہے ۔۔۔ پس اگر جھگڑا ہو تو جس عورت کا ولی نہ ہو تو سلطان اُس کا ولی ہے۔

عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ (ایضاً)

ابو موسیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ولی کے بغیر کوئی نکاح جائز نہیں ہے"۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُزَوِّجُ الْمَرْاَةُ الْمَرْاَةَ وَلَا تُزَوِّجُ الْمَرْاَةُ نَفْسَهَا (سنن کبریٰ للبیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دوسری عورت کا ولی بن کر نکاح نہ کرے، اور نہ کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔

قَالَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ اَيُّمَا اِمْرَاَةٍ لَمْ يُنْكِحْهَا الْوَلِيُّ اَوِ الْوُلَاةُ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ۔ (ایضاً)

حضرت عمرؓ نے فرمایا جس عورت کا نکاح ولی یا حکام نہ کریں، اس کا نکاح باطل ہے۔

عَنْ عِكْرِمَةَ ابْنِ خَالِدٍ قَالَ جَعَلَتِ امْرَاَةٌ ثَيِّبٌ اَمْرَهَا بِيَدِ رَجُلٍ غَيْرِ وَلِيٍّ

عکرمہ ابن خالد سے روایت ہے کہ ایک شوہر دیدہ عورت نے اپنا معاملہ ایک ایسے

فَأَنْكَحَهَا فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُمَرَ فَجَلَدَ النَّاكِحَ وَالْمُنْكِحَ وَرَدَّ نِكَاحَهَا۔ (ایضاً)

شخص کے سپرد کر دیا جو اس کا ولی نہ تھا اور اس شخص نے عورت کا نکاح کر دیا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے نکاح کرنے اور کرانے والے کو کوڑوں کی سزا دی اور نکاح منسوخ کر دیا۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَيُّمَا امْرَاَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِاِذْنِ وَلِيٍّ۔ (ایضاً)

حضرت علیؓ نے فرمایا جس عورت نے بھی اپنے ولی کے اذن کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے بلا اجازتِ ولی کوئی نکاح نہیں۔

عَنِ الشَّعْبِيِّ اَنَّ عُمَرَ وَعَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا وَشُرَيْحًا وَمَسْرُوْقًا رَحِمَهُمَا اللّٰهُ قَالُوْا لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ۔ (ایضاً)

امام شعبی سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ شریح اور مسروق نے فرمایا کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہے

جواب۔ نکاح بلا ولی کے مسئلہ میں جو اختلاف ہے، اس کے بارے میں فریقین کے دلائل پہلے بھی میری نگاہ میں تھے، اب آپ نے بھی انہیں بیان فرما دیا ہے۔ ان دلائل پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دونوں طرف کافی وزن ہے اور یہ کہنے کی بالکل گنجائش نہیں ہے کہ فریقین میں سے کسی کا مسلک بالکل غلط ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شارع نے فی الواقع دو متضاد حکم دیے ہیں، یا ایک حکم کو دوسرا حکم منسوخ کرتا ہے، یا دونوں حکموں کو ملا کر شارع کا منشاء ٹھیک طور پر متحقق ہو سکتا ہے؟ پہلی شق تو صریحاً باطل ہے کیونکہ شریعت کا پورا نظام شارع کی حکمت کاملہ پر دلالت کر رہا ہے اور حکیم سے متضاد احکام کا صدور ممکن نہیں ہے۔ دوسری شق بھی باطل ہے کیونکہ نسخ کا کوئی ثبوت یا قرینہ موجود نہیں ہے اب صرف تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور ہمیں اسی کی تحقیق کرنی چاہیے۔ میں دونوں طرف کے دلائل کو جمع کر کے شارع کا جو منشاء سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے:۔

۱۔ نکاح کے معاملے میں اصل فریقین مرد اور عورت ہیں نہ کہ مرد اور اولیائے عورت۔ اسی بنا پر ایجاب و قبول ناکح اور منکوحہ کے درمیان ہوتا ہے۔

۲- بالغہ عورت (باکرہ ہو یا ثیبہ) کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر یا اس کی مرضی کے خلاف منعقد نہیں ہو سکتا، خواہ وہ نکاح کرنے والا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ جس نکاح میں عورت کی طرف سے رضا نہ ہو، اس میں سرے سے ایجاب ہی موجود نہیں ہوتا کہ ایسا نکاح منعقد ہو سکے۔

۳- مگر شارع اس کو بھی جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنے نکاح کے معاملے میں بالکل ہی خود مختار ہو جائیں، اور جس قسم کے مرد کو چاہیں اپنے اولیا کی مرضی کے خلاف اپنے خاندان میں داماد کی حیثیت سے گھسا لائیں اس لیے جہاں تک عورت کا تعلق ہے، شارع نے اُس کے نکاح کے لیے اُس کی اپنی مرضی کے ساتھ اس کے ولی کی مرضی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ نہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جہاں چاہے اپنا نکاح خود کرلے اور نہ ولی کے لیے جائز ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح جہاں چاہے کر دے۔

۴- اگر کوئی ولی کسی عورت کا نکاح بطور خود کر دے تو وہ عورت کی مرضی پر معلّق ہو گا، وہ منظور کرے تو نکاح قائم رہے گا، نامنظور کرے تو معاملہ عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ یہ نکاح عورت کو منظور ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عورت کو نکاح نامنظور ہے تو عدالت اسے باطل قرار دے گی۔

۵- اگر کوئی عورت اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کرلے تو اس کا نکاح ولی کی اجازت پر معلّق ہو گا۔ ولی منظور کرلے تو نکاح برقرار رہے گا، نامنظور کرے تو یہ معاملہ بھی عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ ولی کے اعتراض و انکار کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ فی الواقع معقول وجوہ کی بنا پر اس مرد کے ساتھ اپنے گھر کی لڑکی کا جوڑ پسند نہیں کرتا تو یہ نکاح فسخ کیا جائے گا اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس عورت کا نکاح کرنے میں اس کا ولی دانستہ تساہل کرتا رہا، یا کسی ناجائز غرض سے اس کو ٹالتا رہا اور عورت نے تنگ آکر اپنا نکاح خود کر لیا تو پھر ایسے ولی کو ساقط الاختیار ٹھیرا دیا جائے گا اور نکاح کو عدالت کی طرف سے سندِ جواز دے دی جائے گی۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

قتلِ خطا اور اُس کے احکام

سوال: ایک پنساری نے غلطی سے ایک خریدار کو غلط دوا دے دی جس سے خریدار خود بھی ہلاک ہو گیا اور دو معصوم بچے (جن کو خریدار نے وہی دوا بے ضرر سمجھ کر دے دی تھی) بھی ضائع ہوئے۔ یہ غلطی پنساری سے بالکل نادانستہ ہوئی۔ خوں بہا اور خدا کے ہاں معافی کی اب کیا سبیل ہے؟ نیز یہ کہ خوں بہا معاف کرنے کا کون مجاز ہے؟

جواب: اسلامی قانون میں قتل کی چار قسمیں ہیں۔ عمد، خطا، شبہ عمد، اور وہ جو ان تینوں میں سے کسی کی تعریف میں نہ آتا ہو۔ یہ فعل جس کا ارتکاب اس پنساری سے ہوا ہے، پہلی تین قسموں میں شمار نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ عمد اور شبہ عمد تو بہر حال نہیں ہے، اور یہ قتلِ خطا بھی نہیں ہے، اس لیے کہ قتلِ خطا کی تعریف یہ ہے کہ آدمی کسی قاتلانہ ہتھیار کو کسی دوسری چیز پر چلائے مگر غلطی سے وہ لگ جائے کسی انسان کو جسے وہ نہ مارنا چاہتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ فعل چوتھی قسم ہی میں آتا ہے جس میں سرے سے کسی کو ضرر پہنچانا مقصود ہی نہیں ہوتا، نہ کوئی ضرر رساں چیز جانتے بوجھتے استعمال ہی کی جاتی ہے، بلکہ بھولے سے یا غفلت سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن فقہائے اسلام نے اس چوتھی قسم کا حکم بھی وہی قرار دیا ہے جو قرآن مجید میں قتلِ خطا کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی اگر مقتول اسلامی حکومت کا شہری ہو تو قاتل کو کفارہ بھی دینا ہوگا اور خوں بہا بھی۔ کفارہ تو خود قرآن میں بتا دیا گیا ہے کہ وہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا، یا پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنا ہے۔ رہا خوں بہا تو اس کی کوئی مقدار قرآن میں نہیں بتائی گئی، مگر احادیث سے یہ بات بتواتر ثابت ہے کہ قتلِ خطا کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ خوں بہا مقرر فرما دیا تھا جن کی قیمت اُس زمانے میں دس ہزار درہم کے برابر تھی۔ (۱۰ ہزار درہم = ۲۲ سیر ۱۲ ½ چھٹانک چاندی)

یہ خوں بہا کا معاملہ اس لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے اور صاف ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے قتلِ خطا کی معافی حاصل کرنے کے لیے کفارے کے ساتھ اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اب اگر ہمارا ملکی قانون قتلِ خطا کی کوئی دوسری سزا دے، خواہ وہ قید ہو یا جرمانہ، تو یقیناً وہ اُس کفارے

اور تاوان کا بدل نہیں ہو سکتی جو آخرت میں ایک مسلمان کو خدا کے حضور بری الذمہ کرنے کے لیے ضروری ہے اس لیے ہم ذرا وضاحت کے ساتھ خونبہا کے قاعدے کو یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو اس سے ٹھیک ٹھیک واقفیت ہو جائے۔

۱۔ خونبہا ادا کرنے کی ذمہ داری شریعت نے صرف قاتل پر نہیں ڈالی ہے بلکہ اس کے "عاقلہ" کو اس کے ساتھ برابر کا شریک کیا ہے۔

۲۔ "عاقلہ" سے مراد، فقہائے حنفیہ کی تحقیق کے مطابق، ایک شخص کے اعوان و انصار ہیں۔ اگر وہ شخص کسی سرکاری محکمہ کا آدمی ہو، تو اس محکمے کے تمام ملازم اس کے عاقلہ ہیں۔ اگر کسی قبیلے یا برادری کا آدمی ہو، تو پورا قبیلہ یا برادری عاقلہ ہے۔ اگر کسی پیشہ ور گروہ کا آدمی ہو تو اس پیشے یا کارخانے کے سب لوگ عاقلہ ہیں۔ ورنہ بدرجۂ آخر، خزانۂ سرکار اس کی دیت ادا کرے گا۔

۳۔ عاقلہ پر قتلِ خطا کی دیت کا یہ بار اس لیے نہیں ڈالا گیا ہے کہ ایک شخص کے گناہ کی سزا سب کو دی جائے، بلکہ اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ایک بھائی پر احیاناً جو بارِ گناہ آ پڑا ہے، اس کی ذمہ داری ادا کرنے میں اُس سے قریبی تعلق رکھنے والے سب لوگ اس کا ہاتھ بٹائیں، اور تنہا اُس پر اتنا بوجھ نہ پڑ جائے کہ اُس کی کمر توڑ دے۔ نیز جس خاندان کو اس کی غلطی کی وجہ سے جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے اُس کی تلافی بھی آسانی سے ہو جائے۔ یہ ایک طرح کا صدقہ یا فی سبیل اللہ چندہ ہے جو ہر اُس شخص کی مدد کے لیے اُس کے وسیع حلقۂ اقارب سے حاصل کیا جاتا ہے جس سے کوئی مہلک غلطی سرزد ہو جائے۔ ہم اس کو اخلاقی انشورنس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

۴۔ عاقلہ سے پورا خوں بہا یک وقت وصول نہیں کیا جائے گا بلکہ تین سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے لیا جائے گا۔ اگر عاقلہ کی وسعت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فی کس دو تین آنے ماہوار سے زیادہ چندے کا بار کسی شخص پر نہیں پڑ سکتا۔

۵۔ یہ چندہ صرف مردوں سے لیا جائے گا۔ عاقلہ میں عورتیں شامل نہیں ہیں۔

۶۔ خونبہا لینے کے حق دار مقتول کے وارث ہوتے ہیں۔ جس قاعدے سے میراث تقسیم ہوتی ہے

اسی قاعدے سے یہ رقم بھی وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

۷۔ مقتول کے وارث ہی خونبہا معاف کرنے کے حق دار ہیں، اور یہ معافی قرآن کی زبان میں ان کی طرف سے قاتل پر صدقہ ہے۔

ان احکام پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ بلا تامل یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ یہ طریقہ اخلاقی و تمدنی حیثیت سے موجودہ ملکی قانون کی بہ نسبت زیادہ افضل ہے۔ اس میں ایک طرف ۶۰ روزوں کا کفارہ اُس شخص کے دل کو پاک کرتا ہے جس کی غفلت یا غلطی سے ایک جان ضائع ہوئی۔ دوسری طرف یہی کفارہ آس پاس کے سب لوگوں کو چوکنا کر دیتا ہے تاکہ وہ ایسی غلطیوں اور غفلتوں میں مبتلا ہونے سے بچیں۔ اس میں ایک طرف خونبہا ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اُس خاندان کے آنسو پونچھے جائیں جس کا ایک فرد قاتل کی غلطی کا شکار ہوا ہے۔ دوسری طرف اس خونبہا کا بار عاقلہ پر ڈال کر اس کی ادائی کو آسان بنا دیا گیا ہے۔ پھر یہ ادائے دیت کی مشترک ذمہ داری ایک طرف عاقلہ کو چوکنا کرتی ہے کہ وہ اپنے افراد کی نگرانی کریں، تو دوسری طرف یہ ہر ہر فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ ایک ہمدرد اور شریکِ رنج و راحت برادری سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ایسی برادری سے جس میں "کسے را با کسے کارے نباشد"۔

عورت اور سفرِ حج

سوال: عورت کے محرم کے بغیر حج پر جانے کے بارے میں علمائے کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ براہِ کرم مختلف مذاہب کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کے نزدیک قابلِ ترجیح مسلک کونسا ہے؟

جواب: عورت کے بلا محرم حج کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس معاملہ میں چار مسلک پائے جاتے ہیں جنہیں مختصراً یہاں بیان کیے دیتا ہوں:۔

(۱) عورت کو کسی حال میں شوہر یا محرم کے بغیر حج نہ کرنا چاہیے۔ یہ مسلک ابراہیم نخعی، طاؤس، شعبی اور

حسن بصری رحمہم اللہ سے منقول ہے اور حنبلی مذہب کا یہی فتویٰ ہے۔

(۲) اگر حج کا سفر تین شبانہ روز سے کم کا ہو تو عورت بلا محرم جا سکتی ہے، لیکن اگر تین دن یا اس سے زائد کا سفر ہو تو شوہر یا محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کا یہی مذہب ہے۔

(۳) جو عورت شوہر یا محرم نہ رکھتی ہو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ جا سکتی ہے جن کی اخلاقی حالت قابلِ اطمینان ہو۔ یہ ابن سیرین، عطاء، زہری، قتادہ اور اوزاعی رحمہم اللہ کا مسلک ہے اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام شافعیؒ نے "قابلِ اطمینان رفیقوں" کی مزید تشریح اس طرح کی ہے کہ اگر چند عورتیں بھروسے کے قابل ہوں اور وہ اپنے محرموں کے ساتھ جا رہی ہوں تو ایک بے شوہر اور بے محرم عورت اُن کے ساتھ جا سکتی ہے۔ البتہ صرف ایک عورت کے ساتھ اُسے نہ جانا چاہیے۔

(۴) ان سب کے خلاف ابن حزمؒ ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ بے محرم عورت کو تنہا ہی حج کے لیے جانا چاہیے۔ اگر وہ شوہر رکھتی ہو اور وہ اسے نہ لے جائے تو شوہر گنہ گار ہوگا مگر عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے بغیر حج کو چلی جائے۔

میں ان چاروں مسالک میں سے تیسرے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس میں ایک دینی فریضہ کو ادا کرنے کی گنجائش بھی ہے، اور اُس فتنے کا احتمال بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث میں عورت کے بلا محرم سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

اخیافی بھائی بہنوں کا حصہ وراثت

سوال: ۔ قدوری (کتاب الفرائض، باب الحجب) میں یہ عبارت درج ہے: اِنْ تَتْرُكُ الْمَرْأَةُ زَوْجًا وَأُمًّا أَوْ جَدَّةً وَإِخْوَةً مِنْ أُمٍّ وَأَخًا مِنْ أَبٍ وَأُمٍّ فَلِلزَّوْجِ النِّصْفُ وَلِلْأُمِّ السُّدُسُ وَلِأَوْلَادِ الْأُمِّ الثُّلُثُ وَلَا شَيْءَ لِلْإِخْوَةِ لِلْأَبِ وَالْأُمِّ "یعنی اگر ایک عورت کے وارثوں میں اُس کا شوہر اور ماں یا دادی اور اخیافی (ماں شریک) بھائی اور سگا بھائی

موجود ہوں تو شوہر کو آدھا حصہ، ماں کو چھٹا حصہ اور اخیافی بھائی بہنوں کو ایک تہائی حصہ ملے گا اور سگے بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ احناف کا مفتیٰ بہ قول ہے؟ کیا یہ قرینِ انصاف ہے کہ برادرِ حقیقی تو محروم ہو جائے اور اخیافی بھائی وارث قرار پائے؟ لفظ 'کلالہ' کی قانونی تعریف بھی واضح فرمائیں۔ کیا والدہ اور دادی کے زندہ ہونے کے باوجود بھی ایک میت کو کلالہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: قدوری سے جو مسئلہ آپ نے نقل کیا ہے، اس میں سلف کے مابین اختلاف ہے۔ اگر کوئی عورت مر جائے اور پیچھے شوہر، ماں، سگے بھائی بہن اور اخیافی (یعنی ماں جائے) بھائی بہن چھوڑے تو حضرت علیؓ، ابو موسیٰ اشعری اور اُبَیّ ابن کعب رضی اللہ عنہم کا فتویٰ یہ ہے کہ اُس کی نصف میراث شوہر کو، ۱/۶ ماں کو اور ۱/۳ اخیافی بھائی بہنوں کو دیا جائے گا اور سگے بھائی بہنوں کو کچھ نہ ملے گا۔ اسی فتوے کو علماء احناف نے لیا ہے اور یہی اُن کا مفتیٰ بہ قول ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عثمانؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت کا مذہب یہ ہے کہ ۱/۳ میراث سگے اور اخیافی بھائی بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی جائے گی۔ حضرت عمرؓ پہلے قولِ اول کے قائل تھے، مگر بعد میں انہوں نے بھی قولِ ثانی کو اختیار کر لیا۔ ابن عباسؓ سے دو روایتیں مروی ہیں، مگر زیادہ معتبر روایت یہی ہے کہ وہ بھی قولِ ثانی کے قائل تھے۔ اسی پر قاضی شُریح نے فیصلہ کیا ہے اور امام شافعی، امام مالک اور سفیان ثوری رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ اخیافی بھائی بہن ذوی الفروض ہیں اور سگے بھائی عصبات ہیں، اور ذوی الفروض کا حق عصبات پر مقدم ہے، لہٰذا جب ذوی الفروض سے کچھ نہ بچے تو عصبات کو کوئی حق نہ پہنچے گا۔ دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ ماں جائے ہونے میں جب سگے اور اخیافی بھائی بہن یکساں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ برابر کے حصے دار نہ ہوں۔

کلالہ کے جو معنی حضرت ابوبکرؓ نے بیان فرمائے ہیں اور جنہیں حضرت عمرؓ نے بھی قبول کیا ہے وہ یہ ہیں مَنْ لَّا وَلَدَ لَهٗ وَلَا وَالِدَ۔ یعنی کلالہ وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ باپ۔ اس طرح ماں یا دادی کی موجودگی کسی میت کے کلالہ ہونے میں مانع نہیں ہے۔

مسئلۂ تقدیر

سوال: - مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر میں ذیل کی متفق علیہ حدیث وارد ہے:-

.... اِنَّ خَلْقَ اَحَدِکُمْ یُجْمَعُ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ .... ثُمَّ یَبْعَثُ اللّٰهُ اِلَیْهِ مَلَکًا بِاَرْبَعِ کَلِمَاتٍ فَیَکْتُبُ عَمَلَهٗ وَاَجَلَهٗ وَرِزْقَهٗ وَشَقِیٌّ اَوْسَعِیْدٌ ثُمَّ یُنْفَخُ فِیْهِ الرُّوْحَ .... (یقیناً تم میں سے ہر ایک کی تخلیق اُس کی ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے .... پھر اللہ تعالیٰ اُس کی طرف ایک فرشتے کو چار باتیں دے کر بھیجتا ہے، چنانچہ وہ اس کے عمل، عمر، رزق اور شقاوت وسعادت کے بارے میں نوشتہ تیار کر دیتا ہے اور پھر اس میں روح پھونک دیتا ہے) - اب سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان سارے معاملات کا فیصلہ ماں کے پیٹ میں ہی ہو جاتا ہے۔ تو پھر آزادیٔ عمل اور ذمہ داریٔ عمل کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ عام طور پر لوگ ایسی ہی احادیث سن لینے کے بعد ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں۔

جواب: - تقدیر کے مسئلے میں آپ کو جو الجھن ہے اسے چند لفظوں میں دُور کرنا مشکل ہے۔ آپ اگر پوری طرح سمجھنا چاہیں تو میری کتاب "مسئلہ جبر و قدر" ملاحظہ فرمائیے۔

حدیث کے بارے میں یہ بات آپ کے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی مسئلے کے سارے پہلو کسی ایک ہی حدیث میں مذکور نہیں ہوتے، اس لیے جو شخص صرف ایک دو روایتوں کو لے کر ان سے کوئی نتیجہ نکالنا چاہے گا وہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جائیگا۔ جو الجھن آپ کو ایک حدیث سے پیش آئی ہے اس سے بہت زیادہ الجھنیں اس صورت میں پیش آئیں گی جبکہ قرآن کی کسی ایک آیت سے آپ کوئی بڑا مسئلہ حل کرنا چاہیں گے اسی مسئلۂ تقدیر کے متعلق قرآن مجید کی کوئی آیت سراسر جبر کا پہلو پیش کرتی ہے اور کوئی دوسری آیت انسانی اختیار کی اہمیت ظاہر کرتی ہے۔ جبر اور اختیار، دونوں ہی بیک وقت انسانی زندگی کے ہر گوشے میں اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اگر مجرّد ایک کو الگ کر کے دیکھا جائے تو دوسرے کا کوئی مقام باقی رہتا نظر نہیں آتا، حالانکہ ایک کو دیکھنے کے ساتھ یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ دوسری حقیقت کا

جو قائم ہے وہ بھی اپنی جگہ بحال رہے۔ مسئلہ تقدیر کی ہر وہ تعبیر جو حقیقت کے ایک رُخ کو دوسرے رُخ کی قطعی نفی کا ذریعہ بنا دے وہ کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم مسائلِ دین کے متعلق ایک جامع نظریہ قائم کرنے کے لیے یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک مسئلہ پر جتنی آیات اور احادیث سے روشنی پڑتی ہو ان سب کو نگاہ میں رکھا جائے۔

جس خاص حدیث کے بارے میں آپ نے اپنی الجھن بیان فرمائی ہے اس پر آپ اس پہلو سے غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ جو بے شمار مخلوق روزانہ پیدا فرما رہا ہے اگر اس کو ان میں سے ہر ہر چیز کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ کس چیز کی کیا استعداد ہے، کس کا دنیا میں کیا کام ہے، اور کس کو نظامِ کائنات میں کس جگہ رہنا ہے اور کیا خدمت سپرد انجام دینی ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) اس بے خبری کے ساتھ ایک دن بھی اس عظیم الشان کائنات کا انتظام چلا سکتا ہے؟ یہ بات آخر کس طرح باور کی جا سکتی ہے کہ دنیا کا خالق اور مدبر اپنی مخلوق کے حال اور مستقبل سے لاعلم ہو؟ یہ تک نہ جانتا ہو کہ کل اس کی سلطنت میں کیا کچھ پیش آنے والا ہے اور اس کو کسی کے اچھے یا بُرے ارادے کا صرف اُسی وقت علم ہو جب وہ اپنا کام کر گذرے! یہ بات نہ صرف خلافِ عقل ہے بلکہ اگر آپ اس کے نتائج پر غور کریں تو اُن الجھنوں سے بہت زیادہ سخت الجھنیں اس سے پیدا ہوتی ہیں جو پیشگی نوشتۂ تقدیر کی خبر سُن کر آپ کے ذہن میں پیدا ہوئی ہیں۔ پس یہ تو بہر حال ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ ما کان وما یکون کا علم رکھتا ہے اور ہر متنفس کا مستقبل اسے معلوم ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ اللہ کے اس علمِ سابق نے ہر متنفس کو وہی کام کرنے پر مجبور بھی کر دیا ہے جو اللہ کو معلوم ہے۔ اللہ کا علم اللہ کی قدرت کی نفی نہیں کرتا۔ اللہ کی قدرت نے ہر انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ بھلائی اور برائی میں سے جس چیز کو چاہے انتخاب کرے، اور اللہ کا علم یہ جانتا ہے کہ کون شخص کیا کچھ انتخاب کریگا۔ غلطی سے اُس ذاتِ پاک کا علم منزہ ہے اور عجز سے اس کی قدرت منزّہ۔

رہی یہ بات کہ لوگ عقیدۂ تقدیر کو غلط معنی میں لے رہے ہیں اور اس کے برے نتائج نکل رہے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک حقیقت کو اس کی وجہ سے بدل ڈالا جائے۔ نہ حقیقتیں

اس بنیاد پر بدل سکتی ہیں کہ لوگ ان کے سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔ غلطی حقیقت کی نہیں بلکہ لوگوں کی سمجھ کی ہے اور وہی اصلاح طلب ہے۔

حُروفِ مقطّعات

سوال:۔ تفہیم القرآن، میں آپ نے حروف مقطعات کی بحث میں لکھا ہے کہ دورِ نزول قرآن میں الفاظ کے قائم مقام ایسے حروف کا استعمال حُسن بیان اور بلاغتِ زبان کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ نیز یہ کہ ان کے معنی و مفہوم بالکل معروف ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفینِ اسلام کی طرف سے اُس وقت ان کے استعمال پر کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ ان حروف کی تشریح چنداں اہمیت نہیں رکھتی اور نہ ان کے سمجھنے پر ہدایت کا انحصار ہے۔ اس بارے میں میری حسبِ ذیل گزارشات ہیں:۔

اگر ان حروف کے معانی ابتدائی دور میں ایسے معروف تھے تو یہ کیونکر ممکن ہوا کہ ان کا استعمال شعر و ادب میں متروک ہو گیا اور دفعتہً ان کے معانی اذہان سے کلیتہً محو ہو گئے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اگر آج بلادِ عربیہ میں چند ایسے الفاظ کا استعمال متروک ہو جائے جو قرآن میں بھی آئے ہیں تو کچھ عرصہ کے بعد دنیائے اسلام میں قرآن کے ان الفاظ کا صحیح مفہوم متعین نہیں رہے گا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر آپ کا یہ استدلال ہے کہ چونکہ ان حروف کے معانی کے تعین پر ہدایت و نجات کا مدار نہیں اس لیے ان کی تشریح و توضیح کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس طرح تو قرآن کے بیشتر حصے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اُس کا مطلب سمجھنے پر ہدایت کا انحصار نہیں اور اُس حصے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے تحت تو تجدد پسند حضرات سے کچھ بعید نہیں کہ وہ قرآن کے ایک حصے کو اہمیت دیں اور دوسرے حصے سے صرفِ نظر کر لیں۔ براہ کرم آپ اپنے موقف کی دوبارہ وضاحت فرمائیں۔

جواب:- آپ نے جو اعتراضات کیے ہیں، ان سے پہلے اگر آپ اُن بحثوں کو پڑھ لیتے جو قدیم ترین تفسیروں سے لے کر آج تک کی تفسیروں میں حروفِ مقطعات پر کی گئی ہیں تو آپ کو میری بات سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوتی، بلکہ شاید اُن بحثوں کے دیکھنے کے بعد آپ محسوس کرتے کہ اس مسئلے میں سب سے زیادہ اطمینان بخش بات وہی ہو سکتی ہے جو میں نے لکھی ہے۔

کسی زبان میں بعض اسالیبِ بیان کا متروک ہو جانا یا معروف نہ رہنا کوئی ایسا انوکھا واقعہ نہیں ہے کہ آپ کو یہ بات سن کر اس قدر تعجب ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن کی بدولت تیرہ سو برس سے عربی زبان کے ادب میں اتنا کم تغیر واقع ہوا ہے، ورنہ اتنی طویل مدت میں تو زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں۔ حروفِ مقطعات زیادہ تر خطابت اور شعر میں استعمال ہوتے تھے، اور ان کے کوئی ایسے متعین معنی نہ تھے کہ باقاعدہ لغت میں وہ درج کیے جاتے، بلکہ یہ ایک اسلوبِ بیان تھا جس سے کثرتِ استعمال کی بنا پر بولنے والے اور سننے والے یکساں طور پر مانوس تھے۔ اسی لیے جب رفتہ رفتہ زبان میں یہ اسلوب کم استعمال ہوتے ہوتے متروک ہو گیا تو لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ تیسری چوتھی صدی کے مفسرین کو ان کے معنی متعین کرنے کے لیے لمبی چوڑی بحثیں کرنی پڑیں اور پھر بھی کوئی تشفی بخش بات نہ کہہ سکے۔ اسالیبِ بیان کے بتدریج متروک ہونے کی شان یہی ہوتی ہے کہ کوئی خاص تاریخ ان کے متروک ہونے کی بیان نہیں کی جا سکتی۔ بس ایک مدت کے بعد محسوس ہونے لگتا ہے کہ لوگ اُن کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جس زمانے میں یہ اسلوب مستعمل تھا اُس زمانے میں اس کی تشریح کی کسی کو ضرورت نہ پیش آئی اور جب یہ مستعمل نہ رہا تو تشریح کی ضرورت بھی پیش آئی اور تشریحات کی بھی گئیں، مگر جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں یہ تشریحات اتنی مختلف تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی تشفی بخش نہ ہو سکی۔

آپ کا یہ شبہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر قرآن کے بعض الفاظ متروک الاستعمال ہو جائیں تو کیا ان کا مفہوم بھی متعین نہ رہے گا؟ الفاظ اور اسالیبِ بیان کو خلط ملط نہ کیجیے۔ الفاظ کے سارے مادے لغت میں ضبط کیے جا چکے ہیں اور ان کی جملہ تشتیقات، نیز محاورے میں ان کے استعمالات، سب کو اہلِ لغت نے

وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ اس لیے اب اگر عربی زبان میں ان کا استعمال عموماً نہ ہو، تب بھی کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ مگر اسالیبِ بیان کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ ان کے معانی کہیں ضبط کیے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ استعمال سے ہی سمجھ میں آتے ہیں، اور استعمال ترک ہونے کے بعد کسی حد تک وہی لوگ اُن کو سمجھ سکتے ہیں جو اُس دَور کے ادب کا کثرت سے مطالعہ کریں جس دَور میں وہ اسالیب مستعمل تھے یہاں تک کہ ان کا ذوق اُن اسالیب سے مانوس ہو جائے۔

مَیں نے حروفِ مقطعات کے متعلق یہ جو بات کہی ہے کہ ان کا مفہوم نہ سمجھنے سے کوئی بڑی قباحت واقع نہیں ہوتی، اسے آپ خواہ مخواہ کھینچ کر بہت دُور لے گئے ہیں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ حروف چونکہ خطیبانہ بلاغت کی شان رکھتے ہیں، اور ان میں کوئی خاص حُکم یا کوئی خاص تعلیم ارشاد نہیں ہوئی ہے، اس لیے اگر آدمی ان کا مطلب نہ سمجھ سکے تو اُس کا یہ نقصان نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو جاننے سے یا کسی تعلیم کا فائدہ اٹھانے سے محروم رہ گیا۔ لہٰذا جب ان کے معنی متعین کرنے کے لیے کوئی اصل ہاتھ نہیں آتا، اور کوئی مستند تشریح بھی نہیں ملتی، تو خواہ مخواہ تکلف سے معنی پیدا کرنے اور تیر تکے لڑانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی صحیح مراد خدا پر چھوڑ دیجیے اور کتاب کی اُن آیات پر تدبر شروع کر دیجیے جنہیں سمجھنے کے ذرائع ہمارے پاس ہیں۔

سر کے بالوں کا جواز و عدمِ جواز

سوال:- آپ نے بعض استفسارات کے جواب میں فرمایا ہے کہ انگریزی طرز کے بالوں کو سر پر رکھنا آپ پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ غیر مسلم اقوام کی وضع ہے، تاہم آپ شرعاً اسے قابلِ اعتراض بھی نہیں سمجھتے۔ لیکن بعض علماء اس وضع کو ناجائز خیال کرتے ہیں۔ آپ اگر ترجمان میں اپنی تحقیق کی وضاحت کر دیں تو دوسرے لوگ بھی مستفید ہو سکیں گے۔

جواب:- سر کے بالوں کے متعلق شریعت کا حکم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حدیث میں "قزع"

کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ قزع کچھ بال مونڈنے اور کچھ رکھنے کو کہتے ہیں۔ یہی چیز ممنوع بالذات ہے اور اسی سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ باقی رہیں دوسری وضعیں تو ان میں سے کسی کے عدم جواز کا ثبوت نہیں ہے، اس لیے وہ سب جائز ہیں، خواہ کوئی سارا سر مونڈ دے، یا سارے سر کے بال کتروائے، یا کچھ کتروائے اور کچھ رکھے، یا نصف کان تک رکھے، یا کان کی لَو تک رکھے یا اس سے بھی نیچے تک۔ یہ سب اس لیے جائز ہیں کہ اصولاً جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔

بعض لوگ کچھ کترنے اور کچھ رکھنے کو بھی قزع کی تعریف میں لاتے ہیں، مگر یہ نہ اس لفظ کا صریح مدلول ہے اور نہ شارع نے بعینہٖ اس چیز کو منع کیا تھا۔ اصل ممنوع کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ہے نہ کہ کچھ کترنا اور کچھ رکھنا۔ اگر ایک شخص ایک کو دوسرے پر قیاس کرکے ممنوع سمجھے، تو اپنے قیاس پر اسے خود ہی عمل کرنا چاہیے، یا پھر اُس شخص کو جو اس کے قیاس کی صحت کا قائل ہو۔ دوسرے کسی شخص کو، جو اس قیاس سے متفق نہ ہو، وہ نہ مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اس کا قیاس تسلیم کرے، اور نہ اس بنا پر گنہ گار ٹھہرا سکتا ہے کہ اس نے حکمِ رسول کے اُس معنی کی پیروی کیوں نہ کی جو میں نے اپنے قیاس و استنباط سے بیان کیے تھے۔

بعض لوگ اس نوعیت کے بالوں کو تشبہ کی تعریف میں لاتے ہیں، مگر وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ تشبہ جس سے شارع نے منع فرمایا ہے، صرف اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ ایک شخص بحیثیت مجموعی اپنی وضع قطع کافروں کے مانند بنائے۔ غیر مسلموں کے فیشن، لباس، اوضاع میں سے بعض اجزا کو لے لینا تشبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ ورنہ آخر اس بات کی کیا توجیہ کی جائے گی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رومی جُبّہ پہنا ہے، کسروانی قبا پہنی ہے، شلوار کو پسند کرکے خریدا ہے جو ایران سے عرب میں نئی نئی پہنچی تھی اور حضرت عمرؓ نے برنس پہنی ہے جو مسیحی درویش پہنا کرتے تھے۔ لہٰذا جزوی تشبہ کی بنا پر کسی کو گنہ گار ٹھہرانا یا فاسق قرار دینا زیادتی ہے۔ البتہ اگر بالوں کی یہ وضع بھی اُسی طرح ممنوع ہوتی جس طرح بڑی بڑی مونچھوں کو مجوس کی وضع کہہ کر منع کر دیا گیا تھا، تو البتہ اس طرح کے بال کتروانے کو گناہ قرار دیا جا سکتا تھا۔

یہاں میں یہ تصریح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اصولاً اس بات کا قائل ہوں، اور اس اصول پر مجھے شدت کے ساتھ اصرار ہے کہ آدمی صرف حکمِ منصوص کی خلاف ورزی سے ہی گنہ گار قرار پا سکتا ہے، قیاس

واستنباط سے نکلے ہوئے احکام کی خلاف ورزی کسی کو گنہ گار نہیں بناتی، بجز اُس شخص کے جو اُس قیاس و استنباط کا قائل ہو۔ اسی طرح مجھے اس بات پر بھی اصرار ہے کہ حرام صرف وہ ہے جسے خدا اور رسول نے بالفاظ صریح حرام کہا ہو، یا جس سے صاف الفاظ میں منع کیا ہو، یا جس میں مبتلا ہونے والے کو سزا کی وعید سنائی ہو، یا نصوص کے اشارات و اقتضاءات سے جن کی حرمت مستنبط ہونے پر اجماع ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو قیاس و اجتہاد سے حرام ٹھہرائی گئی ہوں اور جن میں دلائلِ شرعیہ کی بنا پر دو یا دو سے زیادہ اقوال کی گنجائش ہو، تو وہ مطلقاً حرام نہیں ہیں، بلکہ صرف اُس شخص کے لیے حرام ہیں جو اس قیاس و اجتہاد کو صحیح تسلیم کرے۔ میرے نزدیک اس حقیقت سے اغماض برتنا اُن اہم اسباب میں سے ایک ہے جن کی بنا پر امت کے مختلف گروہوں نے ایک دوسرے کی تضلیل و تفسیق کی ہے۔

ترجمان القرآن

ترجمان القرآن کی جلد ۱، ۲، ۳، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۴ کے متفرق پرچے رباط العلوم الاسلامیہ ۱۰/۱۱ فریر روڈ کراچی کو اپنے ریکارڈ کے لیے مطلوب ہیں۔ یہ ایک لائبریری ہے جہاں ہر شخص مفت مطالعہ کر سکتا ہے۔ پاکستان یا ہندوستان میں جو صاحب مذکورہ بالا جلدوں کے متفرق پرچے قیمتاً دینا چاہتے ہوں وہ ادارہ مذکورہ سے براہِ راست خط و کتابت فرمائیں۔

"المسلمون"

جو اخوان المسلمون کا آرگن ہے اور جس پر ترجمان رمضان و شوال ۱۳۷۱ھ کے صفحہ ۱۰۵ پر تبصرہ ہو چکا ہے، پاکستان میں اس کا سالانہ چندہ دس روپے ہے۔ محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی کے پتے پر بھیج کر سال بھر کے لیے رسالہ باقاعدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نمونے کا پرچہ بھی ایک روپے میں طلب کیا جا سکتا ہے۔